کراچی میں موت کا پہرا

لیجیے ۱۹۹۴ء بھی غرق دریا ہوا' لیکن اہل کراچی کو ابھی تک امن و آشتی کا سراغ نہ مل سکا۔ افسوس! ۱۹۹۴ء کے دامن میں کراچی کے لیے درد و کرب اور غم و اندوہ کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ یوں نظر آتا ہے کہ آسمان سے جو بھی بلا نازل ہوتی ہے' وہ "خانہ انوری" یعنی کراچی کا پتہ پوچھتی ہے۔ ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کراچی میں اوسطاً" ہر روز ٦ آدمی تشدد کا شکار بنتے ہیں۔ یہ تشدد مختلف لباس بدل کر اپنے شکار کی تلاش میں نکلتا ہے اور انسانی زندگی کے تقدس اور قانون کو بڑی بے رحمی سے تاراج کرتا ہوا پولیس کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس بربریت کا ایک گھناؤنا پہلو یہ ہے کہ مسجدوں اور عبادت گاہوں میں بھی انسانی خون بہایا جا رہا ہے۔ قرآن مجید نے جہاں ایک آدمی کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے' وہاں اس کی نگاہ میں سب سے بڑا مجرم اور ظالم وہ شخص ہے جو لوگوں کو عبادت گاہوں میں اللہ کے ذکر سے روکتا ہے۔ اس افسوس ناک صورت حال پر پورا ملک دم بخود ہے اور اداس۔ لیکن اس سنگین مسئلے سے نمٹنے کے لیے ابھی تک ہمیں کوئی قابل عمل' پائیدار اور منصفانہ حل ہاتھ نہیں آیا' جو شہر قائد کو صحیح معنی میں امن و آشتی' خوش حالی اور اخلاقی جمہوریت میں بدل دے۔

حالیہ تشدد و بربریت کی لہر نے ہماری ان تاریخی روایات کو پامال کر دیا ہے' جن کا تعلق رواداری' اختلاف فکر کی آزادی' زندگی کے تقدس اور انسانی

وقار کے تحفظ سے تھا۔ آفت پہ آفت یہ آئی کہ ہم نے نہ صرف اپنی صحت مند مذہبی روایات کو جن کی عظمت کا اعتراف ادہر صدیوں سے اب تک منصف مزاج غیر مسلم بھی کرتے آرہے ہیں' (۱) فراموش کر دیا ہے' بلکہ اپنی حالیہ تاریخ کی پے بہ پے ٹھوکروں سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اس تشدد کے کیا اسباب ہیں' اس کے فروغ میں تعصب' تنگ نظری' فرقہ واریت' احساس محرومی' معاشی ناانصافی اور انتہا پسندی نے (خواہ وہ کسی نام سے بھی ظہور میں آئے) کیا کردار کیا ہے؟ اس بات کا جائزہ تو صحیح معنی میں ایک قومی کمیشن

۱۔ ہم یہاں اختصار سے دو واقعات کا ذکر کریں گے' جواہر لال نہرو نے اپنی معروف کتاب تاریخ عالم (Glimpses of World History, I / 299) میں سپین سے عربوں کی جلاوطنی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:۔ "عربوں پر ایک بڑا الزام یہ تھا کہ مذہب کے بارے میں رواداری برتتے تھے۔ جب ۱۶۰۲ء میں ولنشیا (Valencia) کے بڑے پادری نے سپین سے عربوں کو دیس نکالا دینے کی سفارش کی' اُس نے کہا کہ مذہبی امور میں عرب سب سے زیادہ زور آزادی ضمیر پر دیتے ہیں۔ کتنا بڑا خراج ہے' جو پادری موصوف نے لاشعوری طور پر عربوں کو ادا کیا ہے۔"

یہاں اس واقع کا ذکر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۱۹۶۴ء میں جب نازی لیڈر ر-شمان پر اسرائیل میں مقدمہ چلا' تو پولینڈ کے ایک یہودی نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ دوسری جنگ عالم گیر میں جب جرمن فوجیں پولینڈ میں داخل ہوئیں تو ر-شمان نے یہودی آبادی سے کہا: یہاں سے باہر جانے کے لیے تاوان ادا کرو یا پھر قتل کے لیے تیار ہو جاؤ' چنانچہ یہودیوں نے جان بخشی کے لیے ایک بھاری رقم ادا کی' اور کہا کہ ہم ترکی جانا چاہتے ہیں' کیوں کہ مسلمان ملکوں نے انہیں ہمیشہ پناہ دی ہے۔

ہی لگا سکتا ہے' لیکن عمومی طور پر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اگر ملک میں تعلیمی نظام مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتا' جو بچوں کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو بیدار کر کے ان میں آزاد سوچ پیدا کرتا' اور وقت کی ہر آزمائش اور فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے دلوں میں ذمہ داری اور ادائے فرض کے گہرے شعور کو جنم دیتا اور زندگی کی بلند قدروں سے' جن کا درس مذہب' فلسفہ برابر دیتے آئے ہیں۔ "مضبوط پیمان وفا" کی تلقین کرتا' غرضیکہ اگر ہمارا تعلیمی نظام روح عصر اور روح مذہب سے سرشار ہو کر بچوں کی ذہنی' اخلاقی اور روحانی تربیت کرتا' تو آج ہم صحرا میں نہ کھڑے ہوتے' اب نہ منزل کا پتہ ہے' نہ شاہ راہ منزل پر قدم! ہمارے نظام تعلیم کی بربادی کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ چند سال قبل یونسکو کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ افغانستان اور بھوٹان کو چھوڑ کر پاکستان ایوان علم کی دنیا میں سب سے پیچھے کھڑا ہے' مزید یہ کہ جس رفتار سے ہم خواندگی کی شرح بڑھانے کے لیے کام کر رہے ہیں' اس کے مطابق ہمیں تعلیم کے بین الاقوامی معیار پر پہنچنے کے لیے دو سو سال درکار ہوں گے۔ (ملاحظہ ہو "ڈان" ۲۲ / مئی ۱۹۹۲ء' ایڈیٹر کے نام خط)

۲۔ تعلیمی نظام کی شکست و ریخت سے دوسرے اجتماعی ادارے بھی بری طرح سے متاثر ہوئے' مثلاً جمہوری اور سیاسی اداروں کو استحکام نصیب نہ ہوا۔ ہماری سیاسی تاریخ اس المیہ کا شاید ایک عرصے تک ماتم کرتی رہے گی کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک کم و بیش ہم نے اپنی کسی قومی اسمبلی یا منتخب حکومت کو اپنی مدت پورا کرنے کی اجازت نہیں دی' مظاہروں' توڑ پھوڑ کی سیاست اور بے ہنگم جذباتی نعروں نے ہمارے طرز فکر اور طرز عمل کو صحیح اور سنجیدہ بنیادوں پر کام کرنے سے روک دیا' جس کے نتیجہ میں جمہوری' فکری اور اخلاقی بحران نے جنم لیا۔

۳۔ زندگی کے بارے میں خالص مادی نقطہ نظر نے ایک طرف ہمیں

اخلاقی فساد (Moral Corruption) کی تاریک راہوں میں گم کر دیا' دوسری طرف صحیح تعلیم کے فقدان نے ہمیں سرسید' شبلی' اقبال اور جناح کے مذہبی اور سیاسی افکار سے دور کر دیا' جس کی وجہ سے آج ہماری سوسائٹی ان قسطائی طاقتوں کے نرغے میں آگئی ہے' جن کو شکست دینے کے لیے ان بزرگوں نے جدوجہد کا ایک طویل سفر طے کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ آج ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے سامنے کوئی واضح اور بلند نصب العین نہیں رکھتے' جلال الدین رومی نے صحیح فرمایا تھا کہ اگر علم کا نقطہ نظر مادی ہے تو یہ انسان کے لیے سانپ ہے اور اگر اس کا مقصد روحانی ہے' تو یہ دل کا رفیق و ہم دم ہے۔

علم را بہ تن زنی مارے بود
علم را بردل زنی یارے بود

یہی مادی نقطہ نظر ہے' جس نے تعلیم گاہوں پر قبضہ کرنے کے لیے (چند اداروں کے سوا) رشوت' سفارش' دھونس' دھوکہ دہی اور تشدد کی راہ ہموار کی ہے۔ عام خیال تھا کہ ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کا المیہ ہمیں خواب غفلت سے بیدار کر دے گا اور ہم اپنے من میں ڈوب کر اپنے کردار کا جائزہ لینے کے قابل ہو جائیں گے' لیکن بہ وجوہ ایسا نہ ہوسکا۔ چنانچہ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں' سرکاری ہو یا نیم سرکاری جو سستی' بددیانتی اور کرپشن کی گرفت میں نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس اخلاقی و فکری فساد کے باوجود یہاں چند خدا ترس' راست باز اور ذہین افراد موجود ہیں' جو مختلف بڑے عہدوں پر پورے اخلاص و تندہی سے کام کر رہے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اگر ہم نے مزید وقت ضائع کئے بغیر بدی کی طاقتوں کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ نہ کیا' تو ہمیں اخلاقی فساد کے منطقی نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار رہنا ہو گا۔ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں (جن کی قومی اسمبلی میں اکثریت ہے) دانشوروں' ارباب

قلم کو تخریبی طاقتوں کے چیلنج کو قبول کرنا ہوگا۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ کراچی یا سندھ میں امن و اماں کے مسئلے کا حل نہ تو ماتم کرنے میں مضمر ہے اور نہ ہی زور دار بیانات دینے میں۔ اس مسئلے کا ایک حل یہ ہے کہ ایک قومی کمیشن پوری تندہی اور لگن سے ان تمام اسباب و عوامل کا کھوج لگائے' جو ہمارے بیمار طرز فکر اور طرز عمل کے ذمہ دار ہیں۔ ان اسباب کا سراغ لگانے کے بعد وہ مختلف افراد اور جماعتوں سے مذاکرات کرنے کے بعد ایک مربوط' ٹھوس' اجتماعی اور اقتصادی پروگرام وضع کرے' جس کی بنیاد عدل و انصاف' محبت و اخوت' نظم و ضبط اور باہمی افہام و تفہیم پر ہو' اس پروگرام کو ایک صبر آزما جدوجہد ہی سے عملی شکل دی جاسکتی ہے۔ جب تک کراچی یا ملک کے کسی گروہ اور شہری کو سماجی' اقتصادی' قانونی اور سیاسی انصاف فراہم نہیں ہو جاتا' اور اس کے زخمی احساس کا علاج نہیں کیا جاتا' اس وقت تک کوئی وعظ' کوئی بیان' کوئی تمنا اور کوئی پولیس ایکشن ہمارے دکھ کا مداوا نہیں بن سکتا۔

وقت کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ تشدد و بربریت کا یہ خونی مظاہرہ ایسی دھرتی پر کیا جا رہا ہے' جو صدیوں سے عشق و محبت کی جلوہ گاہ رہی ہے اور جس نے شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرست جیسے پاک باز انسانوں کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے آتشیں نفس اور ملکوتی نغموں سے ہزاروں انسانوں کو نئی زندگی ملی ہے' اور ملتی رہے گی۔ اہل سندھ نے اپنی تابناک تاریخی روایات کو نبھاتے ہوئے قیام پاکستان کے بعد ان ہزارہا انسانو کو خوش آمدید کہا جو وادی گنگ و جمن سے وادی سندھ میں داخل ہوئے تھے' اور جنہوں نے نئی ریاست کی تخلیق میں اپنی فکری اور عملی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا' دونوں' وادی سندھ کے باسی اور نئے سندھی (جن کے بچے آج اپنے آپ کو مہاجر کا نام دیتے ہیں) ایک مدت تک بھائیوں کی طرح رہے' کیوں کہ گنگ و جمن اور وادی سندھ کی تہذیبی و ثقافتی روایات کا بنیادی

سرچشمہ ایک تھا' یعنی خدا پرستی اور انسان دوستی۔ ان عظیم روایات کا پرچار صدیوں پہلے حضرت علی بن عثمان ہجویری' گورونانک' شاہ عبداللطیف بھٹائی' حضرت سچل سرمت اور اس پایہ کے دوسرے عظیم بزرگوں نے اپنی اپنی سرزمین میں کیا تھا۔ صد حرف! کہ مرور وقت کے ساتھ ساتھ بہ وجوہ اختلافات پیدا ہوئے' آگے چل کر ان اختلافات نے تیغ و سنان اور توپ و تفنگ کا سہارا لیا۔ جس کے نتیجے میں آج انسانی خون کراچی کی گلیوں میں بہایا جا رہا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان اختلافات کی تہ تک پہنچیں' اور پھر نہایت ہی ٹھنڈے دل سے ان تمام پردوں کو اٹھا دیں' جو دونوں بھائیوں اور اہل کراچی کے درمیان حائل ہیں۔

ظاہر ہے کہ کوئی بھی تعمیری منصوبہ خواہ وہ کتنا ہی جامع اور ٹھوس کیوں نہ ہو' اس کی کامیابی کا سہرا ان لوگوں کے سر ہوتا ہے جو پوری دیانت' ذہانت اور محنت سے اسے بروئے کار لاتے ہیں' ایسے منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ارباب اختیار سیاسی عزم (political will) سے کام لیتے ہوئے ان کالی بھیڑوں کو نکال باہر کریں' جن کی نااہلی' کام چوری اور اخلاقی پستی نے تعلیم گاہوں' سرکاری دفتروں' مالی اداروں کو اپاہج کر دیا ہے' عوام الناس کے لیے زندگی بسر کرنا ازبس دشوار ہو گیا ہے' اور پوری قوم دنیا کے بازار میں اضحوکہ روزگار بن کر رہ گئی ہے۔

بے شبہ سیاسی اقتدار خدا کی ایک نعمت ہے' جس کے ذریعے اقتدار' سچائی اور بندوں کی خدمت کر کے تاریخ میں زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر اقتدار اپنا رشتہ خدا اور اس کے بندوں سے ٹوٹ لے تو پھر وہ ایک مردہ لاش بن جاتا ہے۔ اقتدار کی اسی مردہ لاش کو حضرت سلیمانؑ نے اپنے تخت پر دیکھ کر اللہ سے رجوع اور استغفار کیا تھا۔

اس نصف صدی میں یہاں کتنے ہی لوگ اپنی سیاست اور قیادت کا

جھنڈا اٹھائے آئے اور چلے گئے۔ آج تاریخ میں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں، تاریخ نے انہی لوگوں کے سامنے سر جھکایا ہے جنہوں نے اپنی انا کے بتوں کو توڑ کر بندوں کی خدمت کی ہے۔ تاریخ آج پھر ہمارا تعاقب کر رہی ہے، اگر ہم نے اپنی راہیں نہ بدلیں تو کل کی طرح آج بھی اس کا فیصلہ ہمارے خلاف ہو گا، جس کی ذمہ داری خود ہمارے اپنے کندھوں پر ہو گی۔

آخر میں اہل کراچی سے بہ صد ادب التماس ہے کہ وہ اپنی صفوں میں انتہا پسندی اور فرقہ واریت کو (خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی) گھسنے کا موقعہ نہ دیں اور یہ نہ بھولیں کہ وہ وادی سندھ اور وادی گنگ و جمن کی عظیم ثقافتی اور روحانی قدروں کے وارث ہیں، اگر ہم میں اپنی وراثت کا صحیح معنوں میں شعور پیدا ہو جائے، تو پھر یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ کس راہ کو اختیار کریں: تشدد، نفرت، خون ریزی کی راہ یا محبت، عشق، نظم و ضبط اور عفو و کرم کی راہ!

رشید احمدؒ (جالندھری)